"اِسْلام اور سائِنْس"

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے۔ ہوم ڈپارٹمنٹ۔ دہلی)

(جمعیت انصار المسلمین شملہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء میں عنوان بالا پر میں نے ایک تقریر کی تھی۔ احباب کا اصرار ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لیے ذہن پر زور دیکر اسے ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہوں جو میرے بعض مضامین میں کہیں شائع ہو چکی ہوں۔ لیکن چونکہ مقصود اسی تقریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ہے۔ اس لیے تکرار و توارد کے احتساب سے درگزر کرتا ہوں۔ پرویز)

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! اور عزیز بھائیو! جیساکہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے وہ "اسلام اور سائنس" ہے۔ سائنس سے مراد علم الکیمیا اور طبعیات ہی نہیں جیساکہ اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منتقل ہو جایا کرتا ہے، بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے تمام ان علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادیات سے متعلق ہوں یا نباتیات سے، عالم حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفس انسانی سے۔ اس کرۂ عناصر کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا پھر کارزمین رانکو ساختہ، اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہونچائیں، یہ علم اور علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور علوم دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں

درخشندہ عہد ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لاکر یہ نظر فریب اطمینان دلادیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم وفنون میں ترقی کررہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو۔ اور داستان کے اس خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلادیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر کی جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہونگے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن میں ان کیفیات ومناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستخرجہ افسون خواب آور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لیے عبرت وموعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھینگے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیے تغیر وتبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور اثری اکتشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کردی ہے کہ مہیب وعمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی یخ بستہ چوٹیاں بحر اطلانطک کی سی گہرائیاں تھیں۔ آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری وساری ہے۔ لیکن ان انقلابات ارضی وسماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا، جیسا ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب وتمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہوجاتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ پھر مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور ہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت وثروت ہی نہیں کھوبیٹھتی بلکہ اسکی ذہنیت بھی کچھ ایسی پستی کے گڑھے میں جاپڑتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے۔ اور رویہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب۔ وہ سعادت ونجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں اور اسکو فلاح وبہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں غرض کہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے سنتی ہے تو انہی کے کانوں سے اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے۔ اور اپنی یہ حالت ہوتی ہے کہ :-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۲۲)

ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج اُمتِ مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

حضرات! زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ۔ زمانہ سے مراد آج اقوام یورپ ہی ہیں کہ وہ ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سی سرعت کے ساتھ اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پس ماندہ اقوام پر ان کی اس محیر العقول ترقی کا جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت پر اس کا خاص طور پر بڑا ہلاکت آفرین اثر پڑا ہے۔ اور اگر اس زہر کو، جو ملت اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جا رہا ہے، جلدی زائل نہ کیا جائے گا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہر خاص کو ہی کھو بیٹھیں۔ یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا روڑا تھا۔ مسیحیت نے علمی ترقیوں کی کس قدر مخالفت کی۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیئے معلوم ہو جائے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ یگانے تھے) جس درندگی کا سلوک کیا ہے قتل و خون ریزی کی بڑی بڑی خونچکاں داستانیں اس کے سامنے شرمندہ ہیں۔ گلیلیو Galileo کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ اور اس نے دوربین کے ذریعے کوپرنکس Copernicus کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوشِ غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور اس مجرم انکشاف حقیقت کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب اسے پیسا Pisa کے بلند مینار پر لے گئے کہ وہاں سے گرا کر اس ملحد کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایک پادری بھی ساتھ گیا کہ مرنے والے سے گناہوں کے اعتراف کی آخری رسم ادا کرائی جائے۔ اس نے وہاں پہنچ کر کہا کہ اگر اب بھی

کہدو کہ زمین ساکن ہے متحرک نہیں تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پرستار صداقت نے وہاں بھی کہدیا کہ ع

بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

"مجھے تو اب بھی زمین متحرک ہی نظر آتی ہے" چنانچہ پیسیا کا مینار آج تک اس کے خون ناحق کا شاہد ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی خلاف محل نہ ہوگا کہ مسیحیت کوپرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟ فلکیات کے متعلق حکمت یونان میں ارسطو کا نظریہ نہایت معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ اس نظریہ کی فیثاغورث وغیرہ نے اسی زمانے میں تردید کر دی تھی لیکن ایں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے اعتقاد میں جملہ کائنات میں اس زمین کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رو سے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی، اس لیے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں تو اس سے چونکہ مسیحیت کے اولین اعتقاد پر زد پڑتی تھی، اس لیے کلیسا نے اسکی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ گلیلیو بیچارے نے چونکہ علی وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لیے حوالہ دار و رسن کر دیا گیا۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ تشدد صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پراٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس کے متعلق خود لوتھر Luther اپولاک اور میلانختھون Melanchthon وغیرہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا نہ تو اور کیا کرتا۔

اِدھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر فطرت۔ جن سے کروڑوں کام لینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر۔ اگنی اور وائیو (پانی۔ آگ اور ہوا) جن کو تابع فرمان بناکر

یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجا لانا پڑتا تھا جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا، اور یہاں بھی قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب یہ مذہب ہمارے موجودہ نکبت و افلاس ہبوط و تنزل پس روی و تہی ماندگی کا واحد ذمہ دار ہمارا مذہب ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑ دیتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔" اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے اسلام کا غلط مفہوم ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب تو نہیں کہ نہ اسکی اصلی تعلیم کے ماخذ مل سکتے ہوں اور نہ اسکی عملی تاریخ میسر آسکے۔ انھیں چاہیے تھا کہ یک طرفہ ڈگری صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقع تو دیتے کہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ کتاب و سنت کو اٹھا کر دیکھتے تاریخ امت کو ملاحظہ کرتے۔ اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے پھرتے۔ اگر اتنی تکلیف گوارا فرما لیتے تو یہ حقیقت ان پر واضح ہو جاتی کہ اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لیے کہ ان کا مذہب انکی علمی ترقیوں کے راستہ میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں مذہب اپنے اوج کمال پر تھا، اوروں کو اگر ترقی کرنے کے لیئے مذہب چھوڑنا پڑا ہے تو یہ ترقی کر ہی نہیں سکیں گے جب تک کہ حقیقی مذہب اسلام کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ یہ نہ تو محض ہماری خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیات یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باب میں اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب ایک خدا پرست قوم نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادات پر مبنی ہوگا کہ کسی جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنا دیا اور اسے اس قدر شرف و اجتباء بخشا ہے

وہ امتیازی خصوصیت کونسی ہے؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ "میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے جب اس پیکر کو دیکھا تو اس کے خمیر میں کچھ آتشین اجزاء بھی انھوں نے مضمر دیکھے۔ عرض کیا کہ بارالٰہا کیا دنیا میں ایسا نائب بنایا جائے گا جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل و خونریزی کا مرتکب ہوگا؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم بہتر جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقعہ پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکر خاکی خلافت و نیابت الٰہی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا"۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں بلا تحدید و تعین تمام حقائق اشیاء کا علم ودیعت کر کے رکھ دیا۔ اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجود ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و اجتبا، جس کی بنا پر انسان خلیفہ فی الارض بنا علم حقائق اشیاء تھا۔ علم الاسماء سے محض الفاظ کی تعلیم مراد لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ اول تو علم کہتے ہی ہیں اور اک معلومات کو جو غیر متبدل ہیں۔ برخلاف الفاظ کے جو ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں۔ پھر جو علم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مقابلے اور معارضے میں عطا فرمایا تھا وہ اس قدر ناقص نہیں ہو سکتا کہ محض اشیاء کے نام بتا دیئے ہوں۔ بلکہ اسماء سے مراد ہیں مسمیات چنانچہ مفسرین کا ایک کثیر گروہ اسی طرف گیا ہے جن میں امام رازی علیہ الرحمۃ بھی شامل ہیں۔ یہی وہ علم الاشیا ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت (Natural Science) سے تعبیر کرتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی ایجاد بتاتا ہے حالانکہ اسلام نے صدیوں پیشتر اسے اصل انسانیت کا امتیاز قرار دیا ہے۔ پھر علم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم نے بیّن الفاظ میں فرما دیا کہ:۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹:۱)

کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں،

چنانچہ تحصیل علم کی تحریک و تحریص کے طور پر نبی اکرم صلعم کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ جو شخص

طلب علم کے لیے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں "

کتاب وسنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم کا ربند ہوئی۔ اگرچہ علمی ترقیوں کی طرف رجحان تو بنی امیہ کے وقت سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اُموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ و بغداد وہ مرکز تھے جہاں سے آفتاب علم و فضل افضلت عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لیے بہت بڑی فرصت درکار ہے اس لیے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم وفنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اُس زمانہ کی حیثیت مجموعی سے کرنا چاہیے۔ آج دنیا من حیث الکل بہت ترقی کر چکی ہے اور ترقی کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہو چکا ہے۔ میں عہد اسلامیہ کی جس ترقی کا ذکر کر رہا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جس میں ابھی یورپ کا بیشتر حصہ پتوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجیے :-

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسےٰ اس Survey Party کے انچارج تھے نیز اس نے ستر (۷۰) علماء (Scholars) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنوایا۔ ان میں الخوارزمی بھی تھے جنہوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے جس میں آج تک کوئی ردوبدل نہیں کیا جا سکا۔ اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پیدل کیا اور اپنے مشاہدات قلم بند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابوبکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔

(۴) ادریسی بھی اس زمانہ کا مشہور جغرافیہ داں ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صقلیہ (سسلی) کے

عیسائی بادشاہ راجر دوم نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا وہاں اس نے بادشاہ کے لیے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لیے مایۂ ناز ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے ایک ذاتی مشاہدات۔ ایک ثقہ روایات اور تیسرا حصہ مطالعہ کتب پر مبنی ہے۔

(۷) الخوارزمی نے اس زمانہ میں جبکہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریہ Arim کہتے ہیں۔ جس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا۔ مشہور فلاسفر بیکن نے اس نظریہ سے استفادہ حاصل کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

(۲) جغرافیہ کے ساتھ ہی جہازرانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانفن تک جا پہنچے تھے اور وہاں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر انہی تجار کی بدولت پھیلا کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا کہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگایا وہ ایک عرب جہازران احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمرو ابن العاص رض (عہد فاروقی) کے حجلۂ دماغ کا رہین منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور جنسی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں۔ مثلاً Traffic وہی لفظ ہے جو عربوں کے یہاں تفریق (یعنی راستہ) تھا Tariff ان کے رسم الطریف سے نکلا ہے۔

(Magazine) عربوں کا مخزن (یعنی اسٹور) ہے۔ Cheque جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے۔ صک کا تفریخ ہے۔ اسی طرح Cotton ان کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ Orange وہاں کا نارنج Lemon لیموں اور Saffaron ان کے یہاں کا زعفران ہے۔ وقس علی ہذا۔ چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں مسٹر سلطبرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحر اطلانطک میں مختلف مقامات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

زمین کے بعد اہل زمین کے حالات یعنی علم تاریخ کو دیکھیے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ۔ فن تاریخ میں (جسے Fronde نے "تاریخ کی سائنس" کہا ہے) آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور جسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہد عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا۔

(۴) اب فلسفہ اور لٹریچر لیجیے جو ایک مہذب قوم کے نظام حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی، مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی۔ ابن سینا۔ ابن رشد وغیرہم حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے سامنے کھولکر رکھدیں۔ حتیٰ کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے اس میں بھی جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستہ سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو Alfonso The wise نے مشہور فلاسفر ابوبکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندہ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر بار کرم ہے۔ قریب قریب یہی الفاظ ہسٹورین ہسٹری اوف دی ورلڈ میں مسٹر ہینڈ نے لکھے ہیں Lewes ہسٹری اوف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم (امام غزالی

کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

اب طب اور طبیعیات کو لیجئے۔ سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافات طبیعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بتمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ ایک قسطنطنیہ ہی کی قریب قریب ستر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف دھری رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہونچائی گئیں اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنسدان حنین بن اسحٰق کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لیے عراق، شام فلسطین اور مصر کا سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لیے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۲۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں۔ جن میں اکثر جر ثقیل، مد و جزر، روشنی، آب و ہوا۔ فلکیات۔ معدنیات اور نباتیات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق۔ جمادیات کی تحقیق۔ زلزلوں کے اسباب۔ حصول آلات۔ ٹمپریچر (مقیاس الحرارت) اور دیگر عناصر طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے جو دسویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقات علمی کے لیے قائم ہوئی تھی، ایک سائنس کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جو ۲۰ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ۱۷ مقالات علم الفطرت Natural Science کے متعلق ہیں۔

ابن خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کیے اور تغذیہ کے لیے حفظ ما تقدم کے اصول متعین کیے۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التاثیر۔ خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے

اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

عملی میکانکس (علم الحیل) کے متعلق حکیم خیسی نے تیرھویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے عملی میکانکس کے آلات ایجاد کرکے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ کاغذ آٹھویں صدی میں اسلامی ممالک میں رائج ہوچکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آتی تھیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب وغریب گھڑی تحفتہً شاہ شارلیمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا (Chemistry) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آتشین مرکبات ایجاد کیے۔ تیزاب مثل نائٹرک ایسڈ ہائیڈروکلورک ایسڈ پوٹاس۔ امونیا۔ کلورائیڈ آف مرکری۔ وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا۔ اور (Gasses) کی خصوصیات دریافت کیں (ملاحظہ ہو Intellectual Development of Europe)

اب فلکیات کو دیکھیے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (Observatory) قائم ہوچکی تھی جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ یحییٰ بن منصور اس رصدگاہ کے انچارج تھے۔ ان کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یورپ کل تک بھی بطلیموسی نظام کا قائل تھا۔ جس کی رو سے زمین ساکن بتائی جاتی تھی۔ لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں، اور اسکی جگہ اس نظام فلکی کی بنا ڈالی جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم وفنون کے متعلق مسٹر ڈی۔ ایل۔ وسوانی۔ ایم۔ اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانے میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ، اور دیگر علوم پر درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہازوں کی ساخت۔ باغوں کی پرورش۔ پھولوں کے تحفظ۔ لوہے اور پیتل کے ظروف۔ سوتی اور ریشم کے کپڑے۔ طباعت و مرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ سب علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات ان علماء اسلام کی ذہنی اُفتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ بھی نہ تھے بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سر انجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انھیں ان علمی کاوشوں پر آمادہ کردیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوت محرکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب مسلمانوں کے نظام حیات میں ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے۔ جب تک دماغ رو بہ صلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس سرچشمہ قوت و صلاح میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اعضاء و جوارح اگرچہ بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حرارت دینی نظام حیات میں موجود تھی اس لیے ہر شعبۂ زندگی اپنی اپنی جگہ نشوو ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے۔ مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ پھر وہ زمانہ کچھ آج کا نہ تھا کہ علمی ریسرچ کے لیے اس قدر آسانیاں موجود ہوتیں۔ آج کسی سرکار کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو۔ فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں اسکی مدد کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ فنڈ جمع کیے جاتے ہیں۔ رفقائے کار سرکیف پا بہ رکاب ہوتے ہیں۔ وہ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تب بھی ہالینڈ کا مکھن لنڈن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی۔ غرض سب کچھ وہیں ان کو پہونچتا رہتا ہے لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ فن حدیث کے امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ وضو کے پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دار العلوم کو مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کے لیے نو ہزار میل کا پیادہ سفر کیا۔ حضرت امام مالک رح فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیے اکثر اوقات چالیس چالیس دن کا سفر کرنا پڑا۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے خاص نباتات کی تحقیق کے لیے روم، یونان، اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی۔

غرضیکہ حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ پنڈلیاں گرد وغبار سے اٹی رہی ہیں۔ لباس چلیتھڑے ہو رہا ہے چہرے پر ضعف ونقاہت سے مردنی چھا رہی ہے۔ لیکن سر میں ایک ولولہ ہے کہ ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اور ان کی یہ ہیئت کذائی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست وپا ئیم کہ ہنوز از دو فور عشق

سود است ودیرم کہ بیاباں برابر است

تہذیب اخلاق وتزکیہ نفس ہو یا تدبیر ملک وتنظیم جیش، علوم وفنون کی تحقیق ہو یا تمدن وتہذیب کی کاوش سب منزلیں اسی جوشش مذہبی کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری

یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

اس لیے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر وتفکر کی تاکید کر رہا ہے کہیں حکم ہے۔ کہیں ترغیب وترہیب کہیں عدم تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور وضابطہ تھا اور منازل حیات کے ایک ایک قدم پر وہ اس سے استشارہ کرتے تھے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا:۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۴۰: ۹)	کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ دور عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا:۔

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتا۔ اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔ آگے نہ بڑھتا" (تفسیر ابن جریر)

انھوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا۔ سیروا فی الارض سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور نظارہ ارضی سے علم جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوام گزشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی تو علم تاریخ مرتب ہوگیا۔ ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کو چشم عبرت سے دیکھا تو آثار قدیمہ کا علم وجود میں آگیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔

انھوں نے اس آیت کو دیکھا :۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (۱۶ : ۱۱)	کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو سما میں مسخر کیے گئے ہیں۔ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا۔ اس میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس میں غور کیا کہ ایمان والوں کے لیے جو اس میں نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچیں۔ انھوں نے کوشش کی اور جر ثقیل، مرکز ثقل کشش ارضی کے نظریے دریافت کیے۔ چنانچہ پروفیسر Deitrici نے جو لکھا ہے کہ "نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں"، تو وہ انھی آیات پر تدبر کا نتیجہ تھا۔ اور یہی وہ نظریے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

انھوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہوگئی کہ آسمانی کرے تمام کرے آغاز پیدائش میں ایک ہیولیٰ سے مرکب تھے۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کرے بن گئے :۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ۔ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (۲۱ : ۳۰)	کیا ان لوگوں نے جو آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا۔ اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے ؟

آیت کے آخری ٹکڑے سے انکی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا قوام اولین پانی سے ہوا کیا رتق وفتق اور پانی کا مبدا حیات ہونا۔ آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں ہیں۔ نظریہ ارتقاء Evolution Theory آج سائنس کی تحقیقات کا معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اسکی ابتدا بھی مسلم ائمہ علم وحکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہین کرم ہے۔ فارابی۔ ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجہ نے اپنی تصانیف میں اس نظریے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ کے ارتقائیوں نے ابتداء میں ضرور ان علماء اسلام کے اشارات سے استفادہ حاصل کیا ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ حکمائے اسلام کے نظریے کے مطابق تمام سلسلۂ نشو و ارتقاء مشیت وارادۂ باری تعالے کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور مغرب کے سائنسدانوں کی تعلیم کی رو سے خدا کی ہستی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یہی اساسی فرق ہے اسلام اور مغربی سائنس میں۔

انھوں نے تکویر لیل و نہار۔ اور تسخیر شمس و قمر پر غور کیا تو فلکیات کے راز ان پر منکشف ہوگئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (۳۹:۱)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا۔ وہ رات (کی تاریکی) پر دن (کی روشنی) اور دن (کی روشنی) پر رات (کی تاریکی) چادر لپیٹ دیتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے۔

جس نظام شمسی کی بنیاد انھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سعد ہے۔ چنانچہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کرکے علم ہیئت کی صحیح منزل کی طرف فارابی کی رہنمائی کی۔ "کل فی فلک" میں ایک لفظی و معنوی صنعت بھی ہے۔ یعنی اس کو اگر الٹ کر بھی پڑھیے پھر بھی "کل فی فلک" ہی بنتا ہے۔ یعنی نصف دائرہ سید ھا پڑھنے سے اور پھر باقی نصف دائرہ الٹنے سے۔ گویا اس طرح سے ایک پورا دائرہ بن جاتا ہے (لطیفات قرآن) خیر یہ تو

ایک ضمنی بات تھی۔ فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریے کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ یہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارے کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارے کو ویگو کہتے ہیں، لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ (۳۶: ۳۸)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست علم والا ہے۔

غرض کہ ان اہل نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت الٰہی - ایک خداوندی نشان - ایک راز فطرت مضمر ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور علمی تجارب سے جنت نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں، رات کی سیاہی میں، شفق کی رنگینی میں، قوس قزح کی بہجت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، بادلوں کی روانیوں میں، نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انھیں صحیفہ فطرت کے اوراق کھلے ہوئے ملتے۔ جو انھیں دعوت علم و عمل دیتے، کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ (۲: ۲۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں۔ اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو پژمردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیے، اور ہواؤں کے (رخ) بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان (معلق) ہیں، سمجھ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر ایک محکم یقین رکھے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس صانع حقیقی کی صنعتوں پر غور کرے اور اسکی نگاہ دقیقہ رس، پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہنچے جہاں ایک ہی قسم کے قوام سے پھول کو مشام جانفزا اور کانٹے کو نوک خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چل رہا ہو تو گل و بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوت نظارہ دے، بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی جڑاو چھت ایک مرصع کار کی تحسین و تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضکہ نہ اس کا اٹھنا بیکار ہو اور نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت ؎

بیٹھے تو عجز نقش کف پا لیے ہوئے ۔۔۔ اُٹھے تو درد دل کا بہانہ لیے ہوئے

اس لیے کہ اس کے خضر راہ کا اشارہ ہے کہ:۔

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳:۲)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات اور دن کے آنے جانے میں، اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا دعوٰی ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ہم دنیا کی ہر ایک چیز کو سود مند کر دکھائیں۔ اور یہ "علم حقایق اشیاء اور علم منافع اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

برادران! سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر ایک چیز کی کنہ حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن دیکھئے تو سہی کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے۔ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے ایک جنگ چلی آتی تھی لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ :۔

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲:۱۰۸)

(اے رسول فرما دیجئے کہ) میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جس نے میری پیروی کی وہ بصیرت کی بنا پر اس راستہ چل رہا ہے

"اسلام اور عقل" ایک مستقل عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً شرح و بسط سے کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسی اور فرصت میں گزارش کروں گا۔ البتہ اس وقت توہم پرستی کے متعلق ایک واقعہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نبی اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس دن سورج گہن لگ گیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک، لوگ فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے کہ آپ کے غم میں اجرام فلکی نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "بجا نہیں۔ چاند اور سورج کا گہن تو اپنی قدرت کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں" کیا توہم پرستی کی جڑ پر اس سے بھی زیادہ شدید کوئی ضرب لگائی جا سکتی ہے؟ اور یہ اس "روشنی" کے زمانہ سے تیرہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکے سے آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے اور مذہب اسلام کے دور عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہنچ گئی تھیں۔ پھر یورپ کے محققین اور حکمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے ان کے ذاتی کیریکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیریکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقویٰ کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ یورپ میں بیکن کو

علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں - لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ پوپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"نوع انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی - ابن تیمیہ - ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج "کم سلام و حمیت" سے لیا جاتا ہے تو محض اس لیے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی - پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لیے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور .... میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالا دست نہ کر دیں - یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے، اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لیے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر مسابقت کی فکر دامنگیر ہے ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا ؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر انکا کیا اثر پڑا ؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا - اس لیے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی - ہندوستان کی علمی دنیا کی مایہ ناز ہستی مسز سروجنی نیڈو نے فرمایا ہے :-

"عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں ؟ فتح و ظفر و دولت کے لیے نہیں - ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا - آج کل ہم ملکی طاقت کے لیے مرتے ہیں - اور علاقوں کا رونا روتے ہیں - مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا - اور مسلم داعی اسی دھن سے کہ ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے - عرب

نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کیے۔ انھوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہنود کے) وہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا۔ ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انھوں نے ڈالی۔ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی۔ اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں کیا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں"

(بحوالہ کیپٹل مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء)

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند، روشن خیال، طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکماء یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی کے ذریعے سے پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریے سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک زندہ معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اسے لیے پھرتے ہیں۔ اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے دماغ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر۔ موڑ توڑ کر۔ قرآن کو یورپ کی ذہنی افتاد کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہل عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات، خواہ کسی ملک میں ہوں، یا کسی زمانہ میں، جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہونچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لیے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی

کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنف حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے ؟

"این خیال است و محال است و جنون"

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریہ کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لیے ہزاروں قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی تو ایک موجد کی زندگی میں ہی اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اسکی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہذا جو نظریہ آج قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اسکی کیا دلیل ہے کہ وہ نظریہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں؟ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی آج تک کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا لیکن اسکی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جبکہ علمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفہ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا۔ حالانکہ فلسفہ کے اصول ہمیشہ قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آج اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی علماء کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال کرتے تھے، ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ ان آیات قرآنی کو جن کی تصدیق کسی زمانہ کے قیاسی نظریوں سے نہ ہو سکے، متشابہات کے تحت میں رکھنا چاہیے اور ان کے متعلق یہ ایمان ہونا چاہیے کہ ان کی حقیقتیں بلاشک و شبہ صحیح اور درست ہیں اور زمانہ کی ترقی سے ایک وقت آئے گا کہ متشابہات انکی تصدیق کر کے انھیں محکمات کے زمرے میں داخل کر دیں گے۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لیے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جو علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس علم کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے :-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷: ۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان - آنکھ اور دل - ان سب سے باز پرس ہوگی -

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع - بصر اور قلب سلیم دیں اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے - علم کے یقینی مرتبہ تک نہیں پہونچتا (مجھے یاد پڑتا ہے کہ صاحب تذکرہ نے بھی غالباً اس آیت سے کچھ ایسا ہی استدلال کیا ہے - یہ بات میں نے کچھ بطور سند کے پیش نہیں کی بلکہ توارد کے طور پر کہدی ہے) - ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے اس میں غور فرمائیے کہ کتنا حصہ ظن وقیاس کا ہے اور کس قدر علم ویقین کا - فلسفہ یونان - منطق - علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان کی ہی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں - وہ بھی ایسی کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انھیں کوئی نہیں قبول کرتا - یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھا رہا - مسئلہ پیش ہوجاتا کہ مرغی کے منہ میں دانت ہوسکتے ہیں یا نہیں ،، اب فلاسفرز کی ایک جماعت اثبات کی طرف اور ایک نفی کی طرف ہو جاتی ہے - دلائل پر دلائل لائے جاتے ہیں - منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں - لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں - حتیٰ کہ بیکن ان میں پیدا ہوا - اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرحہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی اور اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا - آپ حیران ہونگے کہ علم کی اس تعریف بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی - اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں - لیکن ایک ہم ہیں کہ :-

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی اُدھر ہے
وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویۂ نگاہ کو قرآن کریم کی روشنی میں بدلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے "علم دین" کہا جاتا ہے اس سے مقصد ہی یہی ہے کہ ہم زندگی کے مراحل میں اسے شمع ہدایت بنا سکیں اور اسکی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچیں۔ لیکن اگر اس شمع کو ہم اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا، لیکن منزل مقصود تک تو ہم نہیں پہونچ سکتے۔ وہاں تو وہی پہونچیگا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا۔ اور علم دین اور دنیا ہر دو اسی صورت میں کام آ سکتا ہے جبکہ وہ اس قسم کا علم ہو جسکی تعریف قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علم فطرت کہا جاتا ہے۔ سو جب تک اس حصۂ علم کی تکمیل نہ ہو اسلام کا کوئی عالم مکمل عالم نہیں بن سکتا۔ اسلام کے دور ترقی میں عالم کے لفظ سے کسی زاہد گوشہ نشین کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ عالم اور حکیم سے مراد اسوقت وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکالر یا ڈاکٹر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ نظامیہ میں ایک طرف اگر امام غزالی دینیات کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہاؤالدین ریاضی اور تاریخ پر لکچر دیتے تھے۔ خود مساجد میں اس قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں فلسفہ لٹریچر اور طبیعیات پر لیکچر دئیے جاتے تھے۔ اور اسی مکمل تعلیم کا اثر تھا کہ جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے، اور جن کے علمی کارنامے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان کر دیا) کی زندہ تفسیر ہے۔ یقین مانئیے اگر ہم بھی اپنے نظریئے کو بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف کو اپنے پیش نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ؎

زمین از گردش تقدیر ما گردوں شود روزے
فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم